دوسرے کے کام آنا ہے"۔ اسی طرح بشارہ عوض نے کہا کہ "اس وقت فلسطینی چرچ آزمائش میں مبتلا چرچ ہے۔ ہمیں شدّت سے احساس ہے کہ مغربی مسیحیت نے ہمیں مسترد کر دیا ہے۔ وہ اسرائیل کی معاون ہے، چاہے وہ غلط کار ہے یا نہیں"۔ وہ کہتے ہیں کہ مسیحی مسلمانوں اور یہودیوں میں دب کر رہ گئے ہیں۔ "اس لیے ہم باہر کی مسیحی برادری سے کہہ رہے ہیں کہ وہ ہماری مدد کرے۔ اگر ہم ہمیشہ کی طرح فراموش شدہ، مسیحی رہتے ہیں تو مستقبل میں فلسطین کہانیوں کی سرزمین ہوگی اور ہمارے چرچ عجائب گھروں کی مانند ہوں گے"۔

ایشیا

جنوب مشرقی ایشیا میں مسیحیت کی اشاعت

[انڈونیشیا کی ایک مقامی اسلامی تنظیم کی جانب سے Crescent's Indoesia کے نام سے ایک دوماہی خبر نامہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ خبر نامے میں بالعموم ملک کی اسلامی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جناب دلیر نور کا ایک مقالہ "خبر نامے" کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کیا گیا جس میں جنوب مشرقی ایشیا کے تین ممالک - انڈونیشیا، ملائیشیا اور فلپائن میں مسیحیت کی پیش رفت اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ ذیل میں اس مقالے کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ مدیر]

اگرچہ کہا جاتا ہے کہ پہلی صدی مسیحی میں جنوب مشرقی ایشیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچ چکا تھا، مگر اس خطے کے باشندوں کا مسیحیت سے اصل تعارف پندرہویں اور سولہویں صدی میں اُس وقت ہوا جب مغربی نوآبادیاتی طاقتوں نے بغرضِ تجارت اپنے قدم یہاں جمائے۔ ۱۵۱۱ء میں پرتگیزوں نے ملاکا پر قبضہ کیا، مگر جاوا اور جزائر کی دوسری اسلامی سلطنتوں نے پرتگیزوں کے خلاف مزاحمت کی، اور یہ سلسلہ پرتگیزوں کے جانشین ولندیزوں (ڈچ) کے خلاف دوسری عالمی جنگ کے آغاز تک کسی نہ کسی صورت میں چلتا رہا۔ ۱۵۶۱ء میں فلپائن پر ہسپانویوں نے تسلط جمایا۔ مسلمانوں پر پرتگیزوں اور ہسپانویوں کے جبر و تشدّد سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بارہویں سے پندرہویں صدی تک ہسپانیہ پر مسلمانوں کے اقتدار کا بدلہ اس خطے کے مسلمانوں سے لینا چاہتے تھے۔

دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر دُنیا بھر میں آزادی کی لہر آئی۔ بعض قوموں نے انڈونیشیا کی طرح سخت جنگ کے بعد آزادی حاصل کی۔ ملایا اور فلپائن کے لوگوں کی طرح بعض نے پُرامن دستوری راستہ اختیار کیا۔ اگرچہ فلپائن کے مسلمان تاحال اپنی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ انڈونیشیا، ملائیشیا اور

فلپائن کے حالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ملائیشیا میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں جب کہ انڈونیشیا کے لوگ نسلاً ایک ہیں، مگر ان کے متعدد گروہ اپنی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ ملائیشیا کے مشرقی حصے میں یعنی ساراواک اور صباح میں ایک ہی نسل کے لوگوں کا جداگانہ گروہی تشخص بھی ہے۔ دونوں ملکوں میں "ملے" نسل کے لوگ مسلمان ہیں۔ ملائیشیا میں وہ سیاسی طور پر برتری رکھتے ہیں جب کہ انڈونیشیا میں صورت حال یہ نہیں۔ لفظ انڈونیشیا سے واضح ہے کہ یہاں لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

حصولِ آزادی سے پہلے کا دور

انڈونیشیا، ملائیشیا اور فلپائن متعدد جہتوں سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ انڈونیشیا کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ (نوّے فیصد) ملائیشیا بھی مسلمان ملک ہے مگر مسلم آبادی پچاس فیصد سے کچھ ہی زیادہ ہے اور فلپائن کی پانچ کروڑ آبادی میں پانچ سے دس فیصد تک مسلمان ہیں۔

تینوں ممالک کا طرزِ حکومت مختلف رہا ہے۔ آج کے ملائیشیا کا بڑا حصہ مسلم سلطنتوں پر مشتمل تھا جن پر برطانیہ کا بالواسطہ اقتدار تھا۔ سنگاپور، ملاکا اور پنانگ براہ راست برطانوی اقتدار کے تحت تھے۔ ساراواک پر ۱۸۴۰ء سے ۱۹۴۱ء تک راجہ بروک حکمران رہا اور صباح پر "برٹش نارتھ بورنیو چارٹرڈ کمپنی" کا حکم چلتا تھا۔ آخرالذکر دونوں علاقوں کے لوگ اپنی سیاسی صورتِ حال سے اُس وقت باخبر ہوئے جب ۱۹۶۱ء میں ملائیشیا کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ برطانوی نوآبادیاتی دور میں ساراواک اور صباح کے عوام اپنی روایات کے مطابق زندگی گزارتے رہے تھے۔

نوآبادیاتی دور میں مسیحی مبشّروں اور منادوں کو مذہبی نشرواشاعت کی پوری آزادی حاصل رہی اور انہوں نے بالخصوص غیر مسلم قبائل پر توجہ مرکوز رکھی۔

انڈونیشیا میں ڈچ حکمرانوں کی اختیار کردہ ابتدائی پالیسی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مقبوضہ علاقے کے وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اور لوگوں کے مذہب میں مداخلت نہ کی جائے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پالیسی میں تبدیلی آئی اور اپنے مذہب و ثقافت کو اہمیت دی گئی۔ ۱۹۰۱ء میں ڈچ بادشاہ کے جاری کردہ مندرجہ ذیل پیغام سے صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

> ایک مسیحی قوم ہونے کے ناتے نیدرلینڈز کا فرض ہے کہ مجمع الجزائر میں مقامی مسیحی آبادی کی خوش حالی کا خیال رکھے، مسیحی تبشیری سرگرمیوں کو مزید آگے بڑھائے اور پوری انتظامیہ پر واضح کر دے کہ نیدرلینڈز کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ یہ اہداف پورے کرے۔

اس اعلان کے ساتھ سرکاری "اخلاقی" پالیسی کا آغاز ہوا۔ خطّے کے وسائل سے اقتصادی استفادہ ہی سب کچھ نہ رہا بلکہ ثقافتی تبدیلی کو برابر کی اہمیت دی گئی۔ نظری طور پر حکمران مذہبی معاملات میں غیر جانبدار تھے، مگر عملاً مقامی مسیحیوں اور حکمرانوں کے درمیان بہتر تعلقات استوار ہوئے، جب کہ مسلمان آبادی یہ پوزیشن حاصل نہ کر سکی۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ریاست اور مذہب کے درمیان ہر قسم کا تعلق ختم کرنے کے باوجود حکومت مختلف مذہبی تنظیموں کی تعلیمی اور سماجی مساعی میں مدد کرتی رہی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء کے درمیان مسلمانوں کو جو امداد دی گئی، اس سے ۱۰ - ۱۵ گنا زیادہ امداد مسیحی آبادی کو دی گئی جو کل آبادی کا معمولی سا حصّہ تھی۔

"اخلاقی" پالیسی کے تحت تعلیم سے مذہب کا عُنصر نکالا گیا۔ معروف مستشرق اور اسلامی امور پر ڈچ مشیر سنوک ہرگرونے (C. Snouck Hurgronje) نے اس عمل کو مسلمانوں کو ان کے دین سے "آزاد کرنے" سے تعبیر کیا۔ ڈچ ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور جدید تعلیم یافتہ رہنماؤں میں سے بعض نے مذہب اور ریاست کی جُدائی پر زور دیا ہے۔

انڈونیشیا میں کوئی دو سو کے لگ بھگ مختلف گروہ ہیں اور اتنی ہی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں ابتداءً مسیحی سرگرمیوں سے احتراز برتا گیا، مگر بعد میں پالیسی میں تبدیلی آ گئی۔ اور مسلم اکثریتی جاوا میں تبشیری کام کا آغاز کیا گیا۔ پالیسی میں اس تبدیلی کے پس منظر میں ڈچ تجزیہ نگاروں کی یہ رائے شامل تھی کہ سب مسلمان دینی شعور سے یکساں طور پر بہرہ مند نہیں۔ اُن میں سے بعض مسلمان تو کہلاتے ہیں مگر اُن کا عمل اسلامی تعلیمات کے بجائے "مقامی رسوم اور دوسرے مذاہب کے ملغوبے" پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انڈونیشیا کے تمام جزائر کے ساحلی علاقوں میں اسلام مضبوط تھا، مگر دور دراز کے خطّوں میں مظاہر پرستی اور مقامی مذاہب چلے آ رہے تھے، گو ان علاقوں میں مسلمان بھی موجود تھے۔ غربت اور جہالت سے نجات، نیز ترقی کے سنہری خواب نے غیر مسلم آبادی کو مسیحی ہونے پر آمادہ کر دیا، تاہم تین چار صدیوں کے نوآبادیاتی دور میں مسیحی آبادی ایک مختصر سی اقلیت ہی رہی یعنی کل آبادی کا سات آٹھ فیصد۔

ملائیشیا کے وہ علاقے جو بالواسطہ برطانوی تسلّط میں تھے، ان میں مسیحی اشاعتی سرگرمیاں جاری نہ کی جا سکیں، البتہ ملاکا، پنانگ، ساراواک اور صباح کے دروازے ان سرگرمیوں کے لیے کھلے تھے۔ تعلیمی اداروں کے راستے مسیحی اقدار اور سیکولرزم پھیلایا گیا، اگرچہ بہت زیادہ تعداد اس سے متاثر نہ ہوئی۔ ملّے آبادی میں مسیحی مبشّروں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی، البتہ چینی اور ہندوستانی لوگوں میں (جو گزشتہ صدی میں ترکِ وطن کر کے آئے تھے) وہ کامیاب رہے۔ ساراواک اور صباح میں "غیر ملّے"

قبائل میں مسیحیت مقبول ہوئی۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ یہاں اسلام صرف "ملکے" آبادی تک محدود رہا اور یہ آبادی اپنی دُنیا میں مگن رہی۔ اِس نے غیر مسلم مظاہر پرستوں میں کوئی دعوتی کام نہ کیا تھا۔ وہ اقلیت میں رہے اور آزادی کے بعد سیاسی طور پر بھی اقلیتی پوزیشن میں آ گئے۔

جہاں تک فلپائن کا تعلق ہے، نوآبادیاتی طاقتوں کے آنے سے پہلے یہاں مسلمانوں کو غالب حیثیت حاصل تھی، حتیٰ کہ منیلا ایک مسلمان راجہ سلیمان کے کنٹرول میں تھا۔ سولہویں صدی میں راجہ سلیمان کو منیلا سے بے دخل ہونا پڑا، اُس وقت سے مسلمانوں نے جنہیں ہسپانویوں نے "مورو" کا نام دیا، ہتھیار نہیں رکھے۔ مظاہر پرست قبائل میں کیتھولک چرچ کو کامیابی حاصل ہوئی اور کسی حد تک مسلمان آبادی میں بھی۔ تاہم مسلمانوں کی بڑی تعداد نے مزاحمت جاری رکھی، اور آہستہ آہستہ منڈاناؤ سُولو اور پلاوان کے جنوبی جزائر میں محدود ہو گئے۔ اگرچہ مورو نوآبادیاتی طاقتوں کو اپنے ملک سے نہ نکال سکے، تاہم وہ اپنا دینی تشخص قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ جب ۱۹۳۵ء میں امریکیوں نے فلپائن کی آزادی پر بات چیت شروع کی تو مورو مسلمانوں نے واضح طور پر کہا کہ

> ہماری عوامی زمین مورو آبادی کے علاوہ کسی کو نہ دی جائے --- ہمارے رسم و رواج، قوانین اور مورو رہنماؤں کے فیصلوں کو محترم سمجھا جائے --- ہمارے مذہب کو کوئی نقصان نہ پہنچنا چاہیے ہمارے تمام رسم و رواج جو دینِ اسلام پر مبنی ہیں، محترم خیال کیے جائیں، کیوں کہ یہی چیز ہے جس کے لیے مسلمان زندہ رہنا چاہتا ہے --- اگر ہمارا مذہب نہیں تو ہم بھی نہیں۔

آزادی کے بعد

جہاں تک مسیحیت کا تعلق ہے، دوسری عالمی جنگ اور حصول آزادی کے بعد تینوں ملکوں میں صورتِ حال ایک دوسرے سے مختلف رہی۔ یکے بعد دیگرے تینوں ملکوں میں اشاعتِ مسیحیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انڈونیشیا میں بھرپور قوت سے مسیحی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۶۶ء میں ہوا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے خاتمے پر کمیونسٹوں کی طرف سے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش ناکام ہو چکی تھی۔ آزادی کی جدوجہد میں مسیحیوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ انڈونیشیا کے حُرّیت پسندوں سے الگ نہیں، اگرچہ آزادی کی انقلابی جدوجہد کے پیچھے جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ کارفرما تھا۔ نوجوانوں کے مسلح دستے میدان میں جانے سے پہلے علماء کرام اور اپنے بزرگوں سے دُعاؤں کی درخواست کیا کرتے تھے۔ سب سے بڑی

اسلامی جماعت، ماشومی حکومت میں شامل تھی۔ سوئیکار نو جیسے قوم پرست رہنما بھی مسلمانوں کے مذہبی جذبے کو اپیل کرنے پر مجبور تھے۔

۱۹۶۶ء میں فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔ نئے حکمران "مسلم قوتوں" کے بارے میں شک و شبہ کا شکار تھے۔ وہ اُنہیں انتہا پسند کمیونسٹوں کی طرح دائیں بازو کے انتہا پسند خیال کرتے تھے۔ ماشومی کے بہت سے رہنما سیاسی آزادی سے محروم کر دیے گئے۔ حکومت نے اُن غیر جانبدار مسلم اور مسیحی مذہبی رہنماؤں کا تعاون حاصل کیا جن کا عوام میں کوئی اثر و رسوخ نہ تھا۔ اس موقع پر مسیحی کلیسیا نے اُن لوگوں کو تحفظ فراہم کیا جو کمیونسٹ تحریک کی برادر تنظیموں سے وابستگی رکھتے تھے۔ مسلمان جماعتیں اور تنظیمیں اِن لوگوں کو اس لیے گلے نہ لگا سکیں کہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۵ء تک سوئیکار نو کے عہد میں یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلامی تصورِ حیات کو نشانۂ تنقید بنائے رکھا تھا۔ اِن سابق کمیونسٹوں میں سے بعض نے مسیحیت اختیار کر لی۔

مزید برآں سوہارتو حکومت نے ملک کی بگڑی ہوئی حالت کے سدھارنے کے لیے نوآبادیاتی اور ترقی کے پروگرام شروع کیے۔ اِن پروگراموں کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ غربت، جہالت اور بے روزگاری کے خاتمے کے لیے عوام اور حکومت کے درمیان تعاون کی بڑی گنجائش تھی۔ مسیحی تنظیموں اور کلیسیاؤں نے آگے بڑھ کر کام کیا۔ اس دور میں اُن کی سرگرمیوں کے کچھ پہلو یہ تھے۔

۱۔ کلیسیاؤں اور اِن سے وابستہ تنظیموں نے اسکول کھولے۔ اِن میں سے بعض اسکول غریب طلبہ و طالبات کو نہ صرف مُفت تعلیمی سہولتیں مہیا کرتے تھے، بلکہ زیادہ ضرورت مندوں کو وظائف بھی دیتے تھے۔ امداد حاصل کرنے والوں میں مسلمان طلبہ و طالبات بھی شامل تھے۔

۲۔ اسکولوں کے مسیحی ماحول میں مسلمان طلبہ و طالبات کو روزانہ مسیحی رسومات میں شامل ہونا پڑتا تھا، اگرچہ مسلمان طلبہ و طالبات سے یہ توقع رکھنا قانون کے خلاف تھا۔

۳۔ مسیحی تنظیموں نے غیر مہارت یافتہ لوگوں کے لیے مختلف پیشوں میں ٹریننگ کا اہتمام کیا، تاکہ یہ لوگ آسانی سے باعزت معاش تلاش کر سکیں۔ کسانوں کو کھیتی باڑی میں مدد دینے کے لیے بیج، کھاد اور جراثیم کش ادویہ فراہم کی گئیں۔

۴۔ غریب دیہاتیوں کو کپڑے، کمبل اور پیٹرومیکس لیمپ دیے گئے۔ جن دیہات میں بجلی نہ تھی، وہاں پیٹرومیکس لیمپ بالخصوص ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ بیرونی ممالک سے اِس سامان کے جہاز بھر بھر کر آتے تھے اور سارا سامان لوگوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔

۵۔ مسیحی تنظیموں کے زیرِ کفالت بچوں کے لیے معاون والدین (Foster Parents) فراہم کیے گئے۔ امریکہ، آسٹریلیا اور یورپ کے خوشحال مسیحیوں نے ہزاروں میل دور انڈونیشی بچوں کو اُن کی ضروریات کا بوجھ اُٹھا کر اپنا لیا۔ اِن بچوں کی سکول فیس، رہائش کے اخراجات اور جیب خرچ "معاون والدین" مسیحی تنظیموں کو ادا کر دیتے تھے۔ یہ "معاون والدین" اپنے اپنائے ہوئے بچوں کے ساتھ

باقاعدہ خط و کتابت رکھتے اور یوں مسیحیت کا پیغام آہستہ آہستہ ننھے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتا۔ "معاون والدین" اپنے "بچوں" کو مختلف مواقع پر تحائف بھیج کر بھی اپنی محبت اور مذہبیت کا اظہار کرتے تھے۔

۶۔ دیہات میں نلکا سی آب اور صاف پانی کی فراہمی کے منصوبے شروع کیے گئے۔ ان منصوبوں سے نہ صرف اہل دیہات کو زندگی میں سہولت حاصل ہوئی، بلکہ جن لوگوں نے ان منصوبوں میں کام کیا، انہیں معاوضہ دیا گیا۔

۷۔ بے روزگاروں کو روزگار کی تلاش میں مدد دی گئی۔ بالخصوص تعمیراتی کمپنیوں میں جو مسیحی مینیجروں کے زیر انصرام تھیں۔ ملازمتوں میں ان مزدوروں کو ترجیح دی گئی جو اپنے کام کے ساتھ سماجی کاموں میں حصّہ لیتے تھے۔ ان سماجی پروگراموں میں پادری حضرات پیش پیش تھے اور لوگ ان کی گفتگو، جو مذہبی تناظر میں ہوتی تھی سُنتے تھے۔

۸۔ انڈونیشیا کی کل آبادی کا نصف سے زائد حصّہ صرف جاوا میں رہتا ہے اور آبادی کا یہ دباؤ حکومت کے لیے مدّت سے دردسر بنا ہوا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے حکومت کوشش کر رہی ہے کہ لوگ جاوا سے باہر دوسرے جزائر میں منتقل ہوں۔ مسیحی تنظیموں نے اس سلسلے میں حکومت کا ہاتھ بٹایا۔ پہلے ایسے کارکن تیار کیے گئے جو لوگوں کو ہدف بنا کر انہیں ذہنی طور پر دوسرے جزائر میں جانے کے لیے آمادہ کر سکیں۔ جب ایسے کارکن تیار ہو گئے تو وہ لوگوں کو جاوا سے دوسرے جزائر میں لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح اُن جزائر اور علاقوں میں بھی مسیحی آبادی منتقل ہوئی جہاں پہلے اُن کا وجود نہ تھا۔

ایسی شکایات بھی سامنے آئی ہیں کہ نقلِ مکانی کرنے والوں نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا، کیوں کہ میزبان علاقوں کے لوگ اپنے درمیان کسی دوسرے مذہب کو دیکھنا نہ چاہتے تھے، مگر جب جاوا سے جانے والے یہ لوگ اقامت پذیر ہو گئے تو اُنھوں نے اپنی مسیحیت کا اظہار کیا۔ چرچوں کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ یوں مقامی مسلمانوں اور نقلِ مکانی کرنے والے مسیحیوں کے درمیان کشمکش نے جنم لیا۔

۹۔ نقلِ مکانی کا یہ سلسلہ جاوا کے علاوہ دوسرے علاقوں سے بھی جاری رہا۔ مسلمان معاشرے کے اپنے آداب ہیں مگر نئے آنے والے اپنے ساتھ سؤر لے آئے۔ مسلمان جس جانور کو نجس سمجھتے ہیں، وہ گلیوں میں اور مسیحی ہمسایوں کے صحن میں بطور پالتو جانور بندھا ہوا ہے۔ اس معاشرتی اختلافِ نظر کے نتیجے میں ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔

۱۰۔ مسیحی منادوں کی طرف سے ضرورت مند لوگوں کو قرضے بھی فراہم کیے گئے۔ قرض نقد رقم اور اشیاء، دونوں شکلوں میں دیا جاتا تھا۔ اگرچہ شرح سُود معمولی ہوتی تھی مگر غریب لوگ رقم ادا نہ کر سکتے تھے۔ بالآخر ان لوگوں نے قرضوں کے بوجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے مذہب تبدیل کر لیا۔ ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ انڈونیشیا میں اُس وقت کے فرانسیسی ثقافتی قونصل نے ان نو مسیحیوں پر طنز کیا تھا کہ یہ لوگ چاولوں کی خفیف مقدار پر اپنا دین بدل رہے ہیں۔

۱۱۔ مسیحی منادوں نے غریبوں کی امداد کے لیے ہسپتال اور طبّی مراکز قائم کیے ہیں۔ ان ہسپتالوں میں

علاج معالجے کے لیے مسلمانوں کو بھی داخل کیا جاتا ہے۔ ہسپتالوں کی دیواروں پر جا بجا صلیبیں اور حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ بعض اوقات جب مریض بیماری کے ہاتھوں پریشان ہوتے ہیں، پادری اُنہیں مسیح کے نام پر شفا کا پیغام پہنچانے پہنچ جاتے ہیں۔

۱۲۔ دیہاتیوں کے لیے فلم شوز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ فلمیں بالعموم مسیحی مذہبی تناظر میں ہوتی ہیں۔ اس موقع پر دیہات کے سرگردہ لوگوں کو جن سے مزاحمت کا خطرہ ہوتا ہے، ذاتی تعلقات اور تحفے دے کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔

۱۳۔ مسیحیوں نے مسلم روایات کو اپنے رنگ میں اپنا لیا ہے۔ مغربی مسیحی دُنیا میں کبھی بائبل پڑھنے کا مقابلہ نہیں ہوتا۔ یہ تو مسلمان معاشروں کی روایت ہے کہ قرآن کو تجوید و ترتیل سے پڑھا جاتا ہے اور بہتر طور پر پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اب انڈونیشیا میں تلاوت انجیل کے مقابلے ہوتے ہیں۔

۱۴۔ اسی طرح مسلم اصطلاحات اپنا لی گئی ہیں۔ بائبل، اب "الکتاب" ہے، جکارتا کے نواح میں ایک چرچ کو "بیت اللہ" کا نام دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے "مُردوں میں سے جی اٹھنے" کے مسیحی تصوّر کو اب "معراج" کہا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھی "رسول" ہیں اور بائبل کے اقتباسات "اللہ کے فرمان" ہیں۔

ملائیشیا میں انڈونیشیا کے برعکس مسیحی منادّ مسلمانوں میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ دس افراد بھی ایسے نہیں جنہیں مسلم سے مسیحی بنایا گیا ہو۔ مسیحی منادّوں کی ساری کامیابی ملائیشیا کے کچھ قدیم قبیلوں، چینی اور ہندوستانی گروہوں میں ہے۔ صباح اور سارواک میں مسئلے نے سیاسی رُخ اختیار کر لیا ہے۔ جب ٹن مصطفیٰ وزیر اعلیٰ تھے تو غیر مسلم حلقۂ اسلام میں آنے لگے تھے۔ صباح اور سارواک کے مسیحی تعلیم یافتہ اور جنونی ہیں۔ مغربی ملائیشیا کے جاگن، قبائل، مسیحی منادّوں کا ہدف تھے، مگر اب مسیحی کامیابی پہلے جیسی نہیں۔ مسلمانوں کو صورت حال کا احساس ہے۔ نوجوانوں کے لیے تعلیمی اداروں میں اسلامی مضامین کا مطالعہ لازمی ہے، حتیٰ کہ وہ اسکول جو مسیحی منادّوں کے زیر اہتمام ہیں، وہاں بھی اسلامیات کی تدریس ضروری ہے۔ اگرچہ یہ کورس صرف مسلمان طلبہ کے لیے ہیں۔ انڈونیشیا کی صورت حال اس لحاظ سے مختلف ہے، وہاں مسیحی اسکولوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں کہ وہ اپنے مسلمان طلبہ وطالبات کے لیے سرکاری نصاب کے مطابق اسلامیات کی تدریس کا اہتمام کریں۔

ملائیشیا میں کالج کی سطح پر "تمدّن اسلام" ایک لازمی مضمون ہے، اس طرح غیر مسلم طلبہ وطالبات بھی اسلام کے تمدّنی اور تہذیبی پہلوؤں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ملائیشیا میں اس لیے ممکن ہے کہ ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہے، اور یہ جذبہ موجود ہے کہ جو "ملّے" ہے، وہ لازماً مسلمان ہے۔

فلپائن کے آزاد ہونے کے بعد جنوبی حصّے کے مسلمانوں کو زیادہ سختیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آزاد حکومت کا جھکاؤ ہر لحاظ سے مسیحیت کی جانب ہے۔ قومی وحدت کے نام پر شمالی فلپائن کے مسیحی جنوب میں جا جا کر آباد ہوتے ہیں اور ۱۹۳۵ء میں "مورو" مسلمانوں نے اپنے تشخص کا جو اظہار کیا تھا، اِسے مسلسل نظر انداز کیا گیا ہے۔ آج اِس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنے علاقوں میں دب کر رہ

یورپ

"اِس غیر معقول کشمکش کا خاتمہ ہونا چاہیے" - پوپ جان پال دوم

بوسنیا ہرزے گووینا کے مسلمانوں کی نسل کشی جاری ہے اور دُنیا کے اہلِ سیاست "انسانی بنیادی حقوق" کی دہائی دینے کے باوجود رواں صدی کے اس گھمبیر سانحے کو روکنے میں ناکام ہیں۔ مسلمان ممالک اور اُن کی تنظیم "آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس" کا روّیہ بھی مظلوموں کے لیے بحیثیت مجموعی عالمی روّیے سے زیادہ مختلف نہیں۔ بوسنیا ہرزے گووینا کے مسلمانوں اور فی الوقت فریقِ مخالف آرتھوڈکس سربوں کے ساتھ ساتھ کیتھولک کروات بھی اِس جنگ کا حصّہ رہے ہیں۔ پوپ جان پال دوم نے ستمبر ۱۹۹۴ء میں بوسنیا کے دارالحکومت سراجیوو کے دورے کا پروگرام بنایا تھا۔ بوسنیا کے سربراہ عالی جاہ عزت بیگووچ اُن کے دورے کا انتظار کر رہے تھے اور اپنی حد تک پوپ جان پال دوم کی حفاظت کے انتظامات میں مصروف تھے، مگر عالی جاہ عزت بیگووچ کے مطابق اقوامِ متحدہ کے ذمہ داروں نے پوپ جان پال دوم کو حفاظت کے ناکافی انتظامات کے تحت دورہ نہ کرنے کا مشورہ دیا اور یوں پوپ بوسنیا کے عوام سے براہِ راست نہ مل سکے۔

بوسنیا کے دورے کے التواء کے دو ماہ بعد پوپ جان پال دوم نے ۳۰ کلیسیائی عہدہ داروں کو کارڈینل کے منصب پر فائز کیا۔ نئے کارڈینل حضرات میں سراجیوو کے ۴۹ سالہ آرچ بشپ وِنکو پُل جک بھی شامل ہیں۔ ۲۶ نومبر کو ویٹیکن میں منعقدہ جس تقریب میں نئے کارڈینل حضرات کے ناموں کا اعلان کیا گیا، پوپ جان پال دوم نے دوسری باتوں کے ساتھ بوسنیا کی صورتِ حال کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا:

> میں بوسنیا ہرزے گووینا اور سراجیوو کے مسیحیوں کے بارے میں بالخصوص سوچتا ہوں، جہاں بدقسمتی سے ہتھیاروں کی تباہ کن گھن گرج ختم نہیں ہوئی۔ معصوم خون مسلسل بہہ رہا ہے اور امن کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ("نیویارک ٹائمز" ۲۷ نومبر ۱۹۹۴ء)

۷ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ہفت روزہ "ٹائم" (نیویارک) کے نامہ نگاروں اور مدیروں کے وفد سے باتیں کرتے ہوئے پوپ پال دوم نے کہا کہ

> "اِس غیر معقول کشمکش کا خاتمہ ہونا چاہیے جو تمام فریقوں یعنی کروٹس، مسلمانوں اور سربوں کو تباہ کر رہی ہے"۔